نقد واستدراک

# نظم قرآن کے بارے میں
# شاہ ولی اللہؒ اور مولانا مودودیؒ کے نظریات

پروفیسر سیّد احتشام احمد ندوی

تحقیقاتِ اسلامی جلد ۲۶، شمارہ ۳، ۴، جولائی - ستمبر، اکتوبر - دسمبر ۲۰۰۷ء میں جناب حافظ مبشر حسین لاہوری کا مقالہ 'تفسیر میں نظم قرآن کی استدلالی حیثیت' دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ مقالہ عالمانہ ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے نظم قرآن پر مختلف علماء کے خیالات پیش بھی کیے ہیں اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ البتہ ان کی اپنی رائے ہے کہ قرآن مجید کے بارے میں نظم کی بحث چنداں ضروری نہیں ہے۔ یوں بھی یہ بحث عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کسی عمدہ کتاب کے بارے میں یہ بحث کی جائے کہ اس میں ربط ہے اور مضامین و موضوعات میں نظم پایا جاتا ہے۔ بہر حال قدیم و جدید علماء کے درمیان یہ بحث رہی ہے اور فاضل مقالہ نگار نے اس کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

## شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریہ

یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ حافظ مبشر حسین صاحب نے اس پوری بحث میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے خیالات سے تعرّض نہیں کیا ہے۔ اس مسئلہ میں حضرت شاہ صاحب کی رائے ان کی کتاب 'الفوز الکبیر' میں ملتی ہے۔ اس موضوع پر شاہ صاحب کے خیالات سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی رقم طراز ہیں:

''قرآنیات میں فکرِ ولی اللّٰہی کا اظہار ان کی تین چار کتابوں - فتح الرحمٰن، الفوز الکبیر، فتح الخبیر اور مقدمہ در قوانین ترجمہ - میں ہوا ہے۔ شاہ صاحب کا بنیادی موقف یہ ہے کہ قرآن مجید چھوٹے چھوٹے خطبات کا مجموعہ ہے جن کو ایک سورت کے قالب میں نظم و ترتیب و حسن علاقہ کی

بنا پر گوندھ دیا گیا ہے۔ جب متعدد مجموعۂ آیات یا خطبات آ جاتے ہیں تو وہ سورت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ آیتوں کی سورتوں میں ترتیب اور سورتوں کی یکے بعد دیگرے ترتیب و تنظیم ارشاد الٰہی کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی، اس لیے وہ توقیفی تھی۔ قرآن مجید کے یہ خطبات دراصل عربوں یا معاصرین نبوی کے طریقۂ تقریر و اظہار کے مطابق تھے۔ ان میں منطقی ترتیب اور سلسلہ بہ سلسلہ دلائل کی تنظیم کا التزام نہیں کیا جاتا تھا، جیسا کہ بعد کے لکھنے والوں کا ہو گیا ہے۔ اس طریقۂ اظہار میں حکمت یہ تھی کہ وہ نافع ہو اور دل میں اُتر جائے۔ اسی نفع رسانی کی حکمت کی بنا پر قرآن مجید میں مختلف اسالیب اور ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب اور ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف التفات ملتا ہے اور ایک ہی علم کا بیان مرکزاً نہیں کیا جاتا، بلکہ پانچوں علوم قرآنی بار بار تصریف کے طریقہ سے لائے جاتے ہیں۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ پانچوں یا دو تین ترتیب سے یا یکے بعد دیگرے آئیں، بلکہ ایک خطبہ کو دوسرے خطبہ سے اور دوسرے کو تیسرے سے ایک مخصوص آہنگ کے ذریعہ پرو دیا جاتا اور وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات مضمون کی مناسبت کی بنا پر دو خطبوں کو آپس میں جوڑ دیا جاتا ہے، حالانکہ ان میں اسلوب کا فرق ہوتا ہے، لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے، اسالیب کے آہنگ کی رعایت زیادہ کی گئی ہے''۔

(حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، مصنفہ محمد یٰسین مظہر صدیقی، ۲۰۰۱ء، علی گڑھ، ص ۲۴)

شاہ ولی اللہ کے نظریۂ نظم قرآن پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی رقم طراز ہیں:

''وہ (یعنی شاہ ولی اللہؒ) قرآن کو مجموعۂ مکاتیب کے مانند تصور کرتے ہیں، چنانچہ انھوں نے 'الفوز الکبیر' میں اس کی وضاحت اس طرح کی ہے: ''قرآن مجید کو عام کتابوں کی مانند ابواب اور فصول میں اس طرح مرتب نہیں کیا گیا کہ ہر بحث الگ باب یا فصل میں بیان کر دی جاتی، بلکہ قرآن مجید کو مکاتیب کے مجموعہ کی طرح تصور کرنا چاہیے۔ جس طرح کہ بادشاہ اپنی رعایا کو وقت کی ضرورت کے لحاظ سے کوئی فرمان جاری کرتا ہے، پھر دوسرا اور تیسرا فرمان لکھتا ہے، یہاں تک کہ بہت سے فرامین جمع ہو جاتے ہیں اور کوئی شخص ان کو جمع کر کے ایک مجموعہ مرتب کر دیتا ہے۔ اسی طرح شہنشاہِ مطلق نے بندوں کی ہدایت کے لیے رسول اللہ ﷺ پر

حسبِ ضرورت قرآن مجید کی سورتیں یکے بعد دیگرے نازل فرمائیں۔ نبی ﷺ کے زمانہ میں ہر سورت جداگانہ مرتب ومحفوظ تھی۔ آپ نے ان کو مدوّن نہیں فرمایا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک جلد میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کردی گئیں'' (الفوز الکبیر، ص ۴۷)

(حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی قرآنی فکر کا مطالعہ از مولانا محمد سعود عالم قاسمی، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۶)

یہاں پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی اور اور پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی کے بیانات میں کسی قدر اختلاف ہے، لیکن اس سے بہر حال قرآن کے نظم پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔ محترم مبشر حسن نے اپنے مضمون میں شاہ صاحب کا ذکر نہیں کیا ہے۔

## مولانا مودودیؒ کا نظریہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس نقطۂ نظر کو زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد اول کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:

''ایک اور وجہ، اور بڑی اہم وجہ لفظی ترجمے کے غیر مؤثر ہونے کی یہ ہے کہ قرآن کا طرزِ بیان تحریری نہیں، بلکہ تقریری ہے۔ اگر اس کو منتقل کرتے وقت تقریر کی زبان کو تحریر کی زبان میں تبدیل نہ کیا جائے اور جوں کا توں اس کا ترجمہ کر ڈالا جائے تو ساری عبارت غیر مربوط ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید ابتداءً لکھے ہوئے رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیا گیا تھا، بلکہ دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں حسبِ موقع وضرورت ایک تقریر نبی ﷺ پر نازل کی جاتی تھی اور آپ اسے ایک خطبے کی شکل میں لوگوں کو سُناتے تھے۔ تقریر کی زبان اور تحریر کی زبان میں فطرۃً بہت بڑا فرق ہوتا ہے، مثلاً تحریر میں ایک شبہ کو بیان کر کے اسے رفع کیا جاتا ہے، مگر تقریر میں شبہ کرنے والے خود سامنے موجود ہوتے ہیں، اس لیے بسا اوقات یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی ہے: ''لوگ ایسا کہتے ہیں''، بلکہ مقرر آمدِ سخن ہی میں ایک فقرہ ایسا کہہ جاتا ہے جو ان کے شبہ کا جواب ہوتا ہے۔ تحریر میں سلسلۂ کلام سے الگ مگر اس سے قریبی تعلق رکھنے والی کوئی بات کہنی ہو تو اس کو جملۂ معترضہ کے طور پر کسی نہ کسی طرح عبارت سے جدا کر کے لکھا جاتا ہے، تاکہ ربطِ کلام ٹوٹنے نہ پائے۔ لیکن تقریر میں صرف لہجہ اور طرزِ

خطاب بدل کر ایک مقرر بڑے بڑے جملہ ہائے معترضہ بولتا چلا جاتا ہے اور کوئی بے ربطی محسوس نہیں ہوتی۔ تحریر میں بیان کا تعلق ماحول سے جوڑنے کے لیے الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن تقریر میں ماحول خود ہی بیان سے اپنا تعلق جوڑ لیتا ہے اور ماحول کی طرف اشارہ کیے بغیر جو باتیں کہی جاتی ہیں، ان کے درمیان کوئی خلا محسوس نہیں ہوتا۔ تقریر میں متکلّم اور مخاطب بار بار بدلتے ہیں۔ مقرر اپنے زورِ کلام میں موقع و محل کے لحاظ سے کبھی ایک ہی گروہ کا ذکر بصیغۂ غائب کرتا ہے اور کبھی اسے حاضر سمجھ کر براہ راست خطاب کرتا ہے۔ کبھی واحد کا صیغہ بولتا ہے اور کبھی جمع کے صیغے استعمال کرنے لگتا ہے۔ کبھی متکلم وہ خود ہوتا ہے، کبھی کسی گروہ کی طرف سے بولتا ہے، کبھی کسی بالائی طاقت کی نمائندگی کرنے لگتا ہے اور کبھی وہ بالائی طاقت خود اس کی زبان سے بولنے لگتی ہے۔ تقریر میں یہ چیز ایک حُسن پیدا کرتی ہے، مگر تحریر میں آ کر یہی چیز بے جوڑ ہو جاتی ہے۔ یہی وجوہ ہیں کہ جب کسی تقریر کو تحریر کی شکل میں لایا جاتا ہے تو اس کو پڑھتے وقت آدمی لازماً ایک طرح کی بے ربطی محسوس کرتا ہے اور یہ احساس اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے جتنا اصل تقریر کے حالات اور ماحول سے آدمی دور ہوتا جاتا ہے۔ خود قرآنِ عربی میں بھی ناواقف لوگ جس بے ربطی کی شکایت کرتے ہیں، اس کی اصلیت یہی ہے۔ وہاں تو اُس کو دور کرنے کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ تفسیری حواشی کے ذریعہ سے ربطِ کلام کو واضح کیا جائے، کیونکہ قرآن کی اصل عبارت میں کوئی کمی بیشی کرنا حرام ہے۔ لیکن کسی دوسری زبان میں قرآن کی ترجمانی کرتے ہوئے اگر تقریری کی زبان کو احتیاط کے ساتھ تحریر کی زبان میں تبدیل کر لیا جائے، تو بڑی آسانی کے ساتھ یہ بے ربطی دور ہو سکتی ہے۔''

(ملاحظہ ہو تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، جلد اول، ص ۸-۹)

مولانا مودودیؒ نے جو عالمانہ افکار پیش کیے ہیں اور قرآن مجید کی تقریری زبان اور اسلوب کو جس طرح پیش کیا ہے وہ مولانا حمید الدین فراہی کے نظم قرآن سے بالکل مختلف ہے، بلکہ اس سے ایک طرح سے اس کی تردید ہوتی ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ جیسے عباقرۂ قرآنیات کے نظریات سے بالکل تعرض نہیں کیا ہے۔ اس سے مقالہ میں ایک طرح کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔